© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

کسی ملک میں جب کبھی کوئی انقلاب رونما ہوتا ہے اور اس کے زیر اثر تہذیبی، سماجی اور بعض اخلاقی قدر و ں میں ایک تلاطم سا برپا ہو جاتا ہے۔ پرانی قدریں نئی قدروں سے ٹکراتی ہیں اور ماضی کی دیرینہ روایات کا تصا دم وقت کے جدید مطالبوں اور تقاضوں سے ہوتا ہے تو اس وقت سوسائٹی کے ارباب فکر ہمیشہ تین طبقات میں بٹ جاتے ہیں، ایک طبقہ جو قدامت پرست کہلاتا ہے ان لوگوں کا ہوتا ہے جو انقلاب کی قوت و طاقت کا کوئی اندازہ نہیں رکھتے اور اب بھی لکیر کے فقیر بنے ماضی کی ہر چیز کو چمٹے اور جدید تقاضوں سے آنکھیں بند کئے بیٹھے رہتے ہیں۔ اس کے بالمقابل دوسرا طبقہ ان لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جو ماڈرن کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ ماضی کی ہر روایت سے (اگر قولاً نہیں تو عملاً) اپنا تعلق منقطع کر کے ہر نئی چیز کو قبول کر لیتے ہیں اور جس طرف ہوا کا رُخ ہوتا ہے وہ بھی اسی سمت چل پڑتے ہیں۔ ان دونوں طبقوں کے بالمقابل ایک چھوٹا سا گروہ ان حضرات کا ہوتا ہے جو زمانہ کی تغیر پذیر فطرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کو نہ قدیم سے محض اس لئے کہ وہ قدیم ہے کوئی عشق ہوتا ہے اور نہ وہ ہر چیز جس پر جدید ہونے کا ٹھپہ لگا ہو اُس سے چڑ ہوتی ہے۔ ان میں تجزیہ و تحلیل اور تنقید و تبصرہ کی صلاحیت ہوتی ہے وہ جانتے ہیں کہ انسانی معاشرہ ارتقا پذیر ہے۔ معاشرہ کے ایک خاص دور میں جو تہذیبی اور سماجی قدریں بنتی ہیں ان میں رطب و یابس اور حقیقت و مجاز دونوں کی ملاوٹ ہوتی ہے یعنی اُن کے بعض اجزا تو حقیقی اور واقعی ہوتے ہیں جن میں تغیر و تبدل کی نہ ضرورت ہوتی ہے اور نہ گنجائش اور بعض اجزا بعض خارجی اور زمانی و مکانی اسباب کا نتیجہ ہونے کے باعث غیر واقعی ہوتے ہیں اس بنا پر ان کی قدر و قیمت ابدی نہیں بلکہ محض ہنگامی اور وقتی ہوتی ہے۔

اس بنا پر انقلاب کے نتیجہ میں جب قدیم و جدید کی کشمکش اور ماضی و حال کی باہمی آویزش کا معرکہ بپا ہوتا ہے تو یہ تیسرا گروہ قدیم و جدید دونوں کا تجزیہ و تحلیل کر کے ان کے صالح اور غیر صالح عناصر و اجزا کا بالغ نظری کے ساتھ جائزہ لیتا ہے اور پھر حک و فک اور ترمیم و تنسیخ کے اصول سے کام لے کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قدیم کے ابدی اقدار عالیہ کا پیوند جدید کے صالح اور واقعی اجزاء کے ساتھ اس طرح لگاتا ہے کہ انسانی تمدن واجتماع کا درخت نئے ماحول اور نئی آب وہوا میں از سرِ نو سرسبز و شاداب اور تنومند ہو سکے اور اس طرح سماج کا قافلہ صحت مندی کے ساتھ سرگرم سفر رہ سکے۔

پوری دنیا کی تاریخ پڑھ جایئے، آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمیشہ فتح و کامرانی اس تیسرے طبقہ کو ملی ہوئی ہے کیونکہ انسانیت کی تاریخ ارتقار کے طبعی تقاضے اور وقت کے ناگزیر مطالبہ کی تکمیل یہی طبقہ کرتا ہے چنانچہ بڑے بڑے مصلحین اور ریفارمرس اسی طبقہ کے افراد و اشخاص ہوئے ہیں، اگرچہ اس طبقہ کو پہلے طبقہ کی طرف سے بہت شدید اور دوسرے طبقہ کی جانب سے نسبتہً کم مخالفت کا ہر دور اور ہر زمانہ میں سامنا اور ان کے ہاتھوں سخت قسم کے سب وشتم اور مصائب وآلام کا مقابلہ کرنا پڑا ہے لیکن آخر امر دونوں طبقوں کو شکست ہوئی ہے اور جو مخالف تھے ان کے لئے پسپا ہونے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا ہے اور جو چیزیں انقلاب کے آغاز میں معاشرہ کے عام افراد کے لئے ناقابل قبول تھیں ایک زمانہ گزرنے کے بعد وہ اُن کے لئے نہ صرف گوارا بلکہ ضروری ہوگئی ہیں۔ دور نہ جایئے صرف برصغیر ہند و پاک کو دیکھئے۔ اب سے ایک سو برس پہلے انگریزوں کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد ملک جس انقلاب سے دوچار ہوا اس کے نتیجہ میں کتنی چیزیں تھیں جن کی اس وقت شدید ترین مخالفت کی گئی لیکن آج معاشرہ نے ان کو اپنی زندگی کا جزبنا لیا ہے۔

گذشتہ دوسری جنگ عظیم کے بعد عالم اسلام میں جو ایک نہایت عظیم انقلاب رونما ہوا ہے اور جس کے اثرات بہت دوررس اور ہمہ گیر ہیں اُس نے اسلامی معاشرہ کو پھر از سرِ نو قدیم وجدید کی معرکہ آرائی میں مبتلا کر دیا ہے اس لئے یہ وقت علمار کے لئے خاص طور پر بڑا نازک اور اہم ہے۔ [illegible] اپنے فرض ارشاد وہدایتِ عوام سے اس وقت عہدہ برا ہو سکتے ہیں جب کہ وہ روشن ضمیری اور بیدار مغزی کے ساتھ قدیم اور جدید دونوں کا جائزہ لیکر اعتدال وتوازن کی راہ پیدا کر سکیں گے اور اس کے لئے اولین شرط دونوں کو صحیح طرح سمجھنا اور اُن کا مطالعہ کرنا ہے ورنہ محض مقاومتِ مجہول خواہ کتنی ہی مضبوط ہو وقت کی تیز رفتاری کے لئے زنجیرِ پا نہیں بن سکتی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

افسوس ہے کہ گزشتہ ماہ اگست میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے دو منتسبین مولانا محمد جلیل کیرانوی استاذ اور مولانا محمد مبارک علی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند واصل بحق ہو کر اس جہانِ فانی کو الوداع کہہ گئے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ ۔ اول الذکر (المتولد ۱۳۱۲ھ) نے اگرچہ دورۂ حدیث حضرۃ الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کے عہدِ صدارت میں تمام کیا تھا لیکن درحقیقت پروردہ تھے حضرت شیخ الہند کے گھرانے کے ہی۔ نو برس کی عمر تھی کہ ان کے والد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد کر گئے تھے۔ یہ اس آستانۂ قدس کو ایسے چمٹے کہ مرتے دم تک اسے نہ چھوڑا۔ اس لئے حضرت شیخ الہند کے خادم خاص اور شریکِ جلوت و خلوت تھے اس بنا پر حضرت شیخ الہند کی مشہور "ریشمی خطوط" والی تحریک کے جزو کل سے خوب واقف اور اس کے محرم اسرار تھے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے بڑے بڑے مصائب اور شدائد برداشت کئے لیکن تحریک کا بھید آشکارا نہیں کیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ادھر ادھر مدرس رہے۔ آخر میں دیوبند آ گئے تھے اور درس کی خدمات انجام دیتے تھے۔ مولانا محمد مبارک علی صاحب جن کی عمر چھیاسی برس کے قریب ہوگی حضرت شیخ الہند کے شاگردِ خاص اور آپ سے بیعت بھی تھے اور حضرت کی اسارتِ مالٹا کے بعد حضرۃ الاستاذ مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تجدید بیعت کر لی تھی اور حضرت مفتی صاحبؒ کے خدام خاص میں شامل ہو کر حضرت موصوف ہی سے طریقہ نقشبندیہ میں اجازتِ بیعت و ارشاد حاصل کی۔ ایک عرصہ تک ٹونک میں صدر مفتی رہے اور ریشمی خطوط کی تحریک سے بھی تعلق خاص رہا غالباً ۱۹۱۹ء میں مدراس (پرنامبٹ) تشریف لے گئے تھے اور پھر بریلی کے قدیم مدرسہ مصباح العلوم میں صدارتِ درس کی خدمت انجام دی۔ اب کم و بیش اڑتیس سال سے دارالعلوم دیوبند میں نائب مہتمم کے عہدہ پر فائز تھے۔ اہتمام و انتظام میں دسترس کے علاوہ کبھی کبھی حدیث کی کسی کتاب کا درس بھی دیتے تھے۔ تقویٰ و طہارت اور اخلاق و شمائل کے لحاظ سے سلف صالحین کا نمونہ اور مثال تھے صد حیف! دنیا اب ایسے حضرات سے خالی ہوتی جا رہی ہے۔

تغمدهما الله بمغفرته ورحمته

© rasailojaraid.com